ایک مثالی شخصیت

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ

حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹ

قدرت حق کی کرشمہ کاریوں کا دستور بھی نرالا ہے کہ حق اگرچہ اس کے ہاں مطلوب و مقصود کائنات ہے اور باطل مردود و مطرود ہے، مگر حق و باطل کی کشمکش میں جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی، بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ باطل کو خوب کھل کھیلنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اسے اس درجہ عروج بخشتا ہے کہ حق کی مظلومیت اور بے چارگی اور اہل حق کی بے بسی اور محرومی نقطۂ انتہا تک پہنچ جاتی ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا باطل کبھی سرنگوں نہیں ہوگا اور حق کبھی سرفراز و سربلند نہیں ہو سکے گا۔ لیکن حق کی ابتلاء و آزمائش کا یہ سلسلہ جس شدت کے ساتھ ظہور میں آتا ہے، دیکھتی آنکھوں اسی قدر سرعت کے ساتھ یوں ختم ہو جاتا ہے جیسے یہ سب کچھ فریب نظر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً

اور پھر حق اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور لوح ابد پر ہمیشہ کے لیے اپنا نقش دوام ثبت کر جاتا ہے۔ حق و باطل کی اسی کشمکش اور آویزش سے زندگی کا حسن قائم ہے اور ہنگامہ حیات کی تمام رعنائیاں سواد صبح ازل سے لے کر آج تک اسی کشمکش کی رہین منت ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حق و باطل کا یہ تصادم، خیر و شر کا یہ ٹکراؤ، نور و ظلمت کی یہ آویزش، حسن و قبح کا یہ تضاد اور سپید و سیاہ کی یہ کش مکش فطرت کائنات کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔

لیکن اس کائنات ارضی و سماوی میں ایک انسان اللہ کی ایسی مخلوق ہے، جسے شعور و آگہی کی نعمت سے نوازا گیا ہے تاکہ وہ اس کشمکش و تضاد کے ہنگامۂ کارزار میں باطل کے مقابلہ میں حق کو، شر کے مقابلہ میں خیر کو، ظلمت کے مقابلہ میں نور کو، قبح کے مقابلہ میں حسن کو اور سیاہ کے مقابلہ میں سپید کو پہچان سکے اور پھر ان میں امتیاز پیدا کر کے اپنے لیے وہ راہ منتخب کرے جو اس کے لیے فوز و فلاح اور سعادت و کرامت کی کفیل ہو۔ حق و باطل اور خیر و شر کی یہ آویزش اگر عرصۂ دہر سے معدوم ہو جائے تو زندگی کا سارا حسن غارت ہو کر رہ جائے اور خود انسانی زندگی کی قدر و قیمت ختم ہو جائے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور آسمانی وحی کا نزول اسی کش مکش اور آویزش کی ایک کڑی ہے اور ہدایت خداوندی کی نمود کا مقصد وحید بھی یہی رہا ہے کہ لوگ باطل کے مقابلہ میں حق کی حمایت کریں اور شر کے بدلے خیر کو اختیار کریں۔

وما یستوی الاعمی و البصیر	اور اندھا اور بینا برابر نہیں ہیں اور نہ اندھیرا
ولا الظلمات ولا النور ولا	اور اجالا اور نہ ہی سایہ اور لُو برابر ہیں اور نہ
الظل ولا الحرور وما یستوی	ہی زندہ اور مردہ برابر ہیں۔
الاحیاء ولا الاموات	(فاطر)

اسی طرح مومن جس کو اللہ نے دل کی آنکھیں دی ہیں اور کافر جو دل کا اندھا ہے، آپس میں برابر نہیں ہیں۔ اگر تمام نسل انسانی کے افراد ایک ہی راہ پر گامزن ہوتے اور ایک ہی ڈگر پر چلتے رہتے تو نیک و بد کی تمیز کیوں کر ہوتی اور بُرے بھلے کا فرق کیسے ملحوظ رکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کش مکش کا وجود ناگزیر تھا۔

وبضدها تتبین الاشیاء

اسلام کی چہاردہ صد سالہ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں اور تمام صحف سماوی اس بات پر شاہد ہیں کہ بدؤ تخلیق عالم سے لے کر آج تک خیر و شر اور حق و باطل اور نور و ظلمت کے درمیان تصادم کی یہ کیفیت ہر دور میں رونما ہوتی رہی اور یوں حق تعالیٰ انسانوں کے درمیان امتیاز کی ایک لکیر کھینچتا رہا

اور خیر و شر کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرتا رہا تاکہ جزا و سزا کا ابدی قانون بروئے کار آئے اور اہلِ حق اپنی جزا لے جائیں اور باطل سیرت اپنی سزا کو پہنچیں۔

لیمیز اللہ الخبیث من الطیب و یجعل الخبیث بعضہ علی بعض فیرکمہ جمیعا فیجعلہ فی جہنم

حق و باطل کی ایسی ہی ایک کش مکش وہ تھی جس کا ظہور حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کے عہد میں ہوا۔ باطل اپنی پوری قہرمانیوں کے ساتھ ان کے دور میں پرافشاں ہوا اور اس کی تیرہ کاریوں نے برصغیر ہند و پاک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حق اور اہلِ حق پر ذلت و ادبار کی پرچھائیں پڑنے لگیں اور باطل کی ظلمت عرصۂ دہر پر یوں محیط ہوگئی کہ "ظلمت بعضہا فوق بعض" کا عجیب نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

ایسے پُرآشوب اور تیرہ و تار دور میں توفیقِ الٰہی کی دستگیری نے حضرت الامامؒ کو حق کا پشتیبان بنا کر کھڑا کیا اور حق کی پاسبانی کی گراں قدر خدمت ان کے سپرد کی۔ انہوں نے ظلمتِ باطل کے اس گھٹا ٹوپ اندھیارے میں اپنے نفسِ گرم و آہِ سرد کی تاثیر سے ایک چراغ روشن کیا جو بڑھتے بڑھتے وقت کی نامساعدت اور آب و ہوا کی ناموافقت کے باوجود ایک مینارِ نور بن گیا اور اس کی ضیاء باریوں سے نہ صرف اس برصغیر کے اطراف و اکناف میں دلوں کی دنیا روشن ہوئی بلکہ ایک عالم اس کی جہاں تابیوں سے منور ہوا ؎

یک چراغے ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند!

حضرت الامام ولی اللہ الدہلویؒ نے (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) بارہویں صدی ہجری میں علم و عرفان کی جو شمع روشن کی اور حق و صداقت کا جو چراغ فروزاں کیا، حالات کی کوئی آندھی اس کو نہ بجھا سکی اور حق تعالیٰ کا شاہ صاحبؒ پر یہ خاص لطف و کرم اور خصوصی فضل تھا کہ انہیں ایسی اولادِ صالح سے بہرۂ وافر عطا ہوا جو ان کے تقوے اور علم و فضل کے حقیقی وارث تھے اور ایسے مخلص، پرجوش اور باہمت تلامذہ نصیب ہوئے جنہوں نے اس چراغ کی لَو کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ ان حضرات نے اپنی نقد جان اور اپنا خونِ دل جلا کر بھی اس چراغ کو فروزاں رکھا۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے تجدید احیائے دین کے سلسلہ میں جو گراں بہا خدمات سرانجام دیں ان کی صحیح قدر و منزلت کا اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ برصغیر کی پوری سیاسی اور دینی تاریخ پیشِ نظر ہو۔ اس لیے کہ عجمی آب و ہوا میں کسی ایسے شخص کا ابھرنا جو صدیوں کی سرشاری کا اثاثہ لے کر آیا تھا اس کی داستانِ حیات کی پوری عظمت و اہمیت کا اس وقت تک اندازہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس پس منظر سے بخوبی واقفیت حاصل نہ ہو جس میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلوی قدس سرہٗ نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑا اٹھایا۔

بدقسمتی سے ہمارے تذکرہ نگاروں کا یہ عام انداز ہو گیا ہے کہ وہ جب کبھی کسی شخصیت کی بابت قلم اٹھاتے ہیں تو وہ شخصیتوں کے تقابل میں تقدم و تاخرِ زمانی کے چکر میں پڑ کر اس شخصیت کی صحیح قدر و منزلت کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ مبادا اس سے کسی ایسی شخصیت پر اس کو ترجیح حاصل ہو جائے جو چند سال یا چند سو سال پہلے گزری ہے۔

اس ترجیح بلا مرجح ہی کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاک میں بہت سی ایسی شخصیتیں بے نام ہو کر رہ گئیں جو اپنی دینی خدمات، علمی وسعت، فکری رفعت اور تجدیدی صلاحیت کی بنا پر اس قابل تھیں کہ انہیں قرونِ اولیٰ مشہود لہا بالخیر کے ائمہ اعلام کی فہرست میں شمار کیا جاتا۔ مگر برا ہو اس تقدم و تاخرِ زمانی کے غلط تصور کا کہ اس نے نسبتاً کم تر درجہ کے لوگوں کو بالا و بلند کر دیا اور بالا اور بلندوں کو کہتر قرار دیا، حالانکہ یہ تصور خود اسلام کے مزاج اور اس کی روح کے سراسر منافی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ :-

مثل امتی کمثل المطر الوابل لا یدری اولہ خیر ام اخرہ

ترجمہ: میری امت کی مثال موسلا دھار بارش کی ہے جس کے متعلق علم نہیں ہوتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ قدس سرہٗ باوجودیکہ بارہویں صدی ہجری کی شخصیت تھے، مگر انہوں نے فکر و نظر کے جو زاویے پیش کیے اور اسلام کے علوم و افکار کی تعبیر کا جو اسلوبِ جدید انہوں نے اختیار فرمایا، اس کی نظیر پچھلی صدیوں میں دور دور تک نہیں ملتی۔

ایک ہزار برس کی مدت نے تعصبات کی جو گرد اڑائی تھی۔ تحزب و تشیع کی جن تنگناؤں

کو تراشا تھا۔ فقہ و اجتہاد کے جن دروازوں کو بند کیا تھا اور تحقیق کے نام پر جہالت کے جس چلن کو عام کیا تھا، اس کو بدلنے اور اس کا رُخ موڑنے کے لیے جس جامع صفات انسان کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنا نہ کسی صوفی کے بس کا روگ تھا نہ کسی ظاہر پرست عالم کا، نہ کسی درویش کا نہ قلندر کا بلکہ "مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند" کے قبیل کا ایسا شخص در کار تھا، جو قدیم و جدید کے تقاضوں سے نہ صرف باخبر ہو بلکہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی تب و تاب جاودانہ کا حامل بھی ہو اور وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کام کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے زیادہ موزوں شخصیت اور کوئی نہ تھی ؎

مضت الدھور و ما اتین بمثلہ

ولقد اتٰی فعجزن عن نظراء ثہٖ

ایسی مہتم بالشان اور عظیم المرتبت شخصیت کو تاخر زمانی سے نہ کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، نہ تقدم زمانی سے اس کی شان میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کی عظمت و جلالت کے لیے یہی بات بس کرتی ہے کہ اس نے ایک ایسے زبوں کار دور میں آوازۂ حق و صداقت بلند کیا جب کہ کان اس کے سننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ایک ایسے اسلوب سے اسے تعبیر کیا جو آئندہ و موجود کے تمام درپیش مسائل کے بارے میں فکر انسانی کی ٹھیک ٹھیک راہ نمائی کر سکے۔

حضرت الامام قدس سرہٗ نے تعلیماتِ اسلامی کو جس ڈھنگ سے امت کے سامنے پیش کیا۔ اس کی تفہیم کے لیے جو طرز بیان انہوں نے ایجاد کیا اور اسلامی مسائل کی جیسی کچھ تنقیح انہوں نے کی۔ اس کا وقتِ نظر سے اگر مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مبدء فیاض کی جانب سے انہیں علوم اسلامیہ میں غیر معمولی ادراک نصیب ہوا تھا اور وہ انشراح صدر کی دولت سے مالامال تھے۔

پوری اسلامی تاریخ میں وہ پہلے محقق اور مفکر ہیں جنہوں نے امور شریعت کے اسرار و حکم کا منطقی اور عقلی تجزیہ کیا اور اسلامی تاریخ کی پیچیدگیوں کو اس طرح سلجھایا کہ وہ اذہان و قلوب جو شک و تذبذب کی گرداب میں پھنسے ہوئے تھے، ان کو طمانیتِ قلب اور سکینت نصیب ہو گئی۔ پھر ان کا ایک قابل ذکر کارنامہ جس کے لیے وہ پوری امت کی جانب سے مستحق تبریک و تحسین ہیں،

یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تمام افکار و نظریات کی اساس قرآن حکیم کو ٹھہرایا اور اس باب میں ان کو یہ شرف و امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ محض ایک فقیہ کے زاویۂ نگاہ سے نہیں کیا بلکہ ایک عالم کی جتنی بھی حیثیتیں ممکن ہیں ان میں سے فرداً فرداً ہر حیثیت سے انہوں نے اس سرچشمۂ ہدایت سے اپنی تشنگی بجھائی۔ تاریخ میں، فلسفہ میں، سیاست میں، اقتصادیات، معاشیات، معاشرت اور عمرانیات وغیرہ میں، تہذیب و تمدن کے اصول و ضوابط کی ترتیب و تدوین میں، سماجی برائیوں کے استیصال کے معاملہ میں اور معاشرتی خرابیوں کے ازالہ کے لیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فقہ اور اصول فقہ میں، حدیث اور روایت و درایت کے سلسلہ میں انہوں نے قرآن حکیم ہی کے اصولوں کو اپنا راہ نما قرار دے کر اور ان سے کسب نور و ضیاء کر کے وہ کچھ حوالۂ قرطاس کیا جس کی ضرورت ربع مسکون کے ہر خطہ اور ہر نسل کے باشندوں کو لاحق تھی۔

فرانس کے وہ مفکر جنہوں نے یورپ کے اس تہذیبی مرکز میں لباط کہنہ کو الٹ کر ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی اور پوری دنیا کے نظام سیاست میں انقلاب برپا کر دیا۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ وہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ ہی کے افکار کی صدائے بازگشت تھی؟ صدائے بازگشت یوں کہ ژان ژوک روسو (۱۷۱۲ء ـــــ ۱۷۷۸) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب میں تمدن و معاشرت کی جن برائیوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی ان اسباب و عوامل کا مبصرانہ تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ان خرابیوں کا اصل باعث کیا ہے اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے ان کے ازالے کی صورتیں بھی تجویز فرمائیں ہیں اور واقعات گذشتہ اور حالات پیش آئندہ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ قائم کیا ہے۔ فقہی مسالک اور فکری مکاتب میں ایک مدت مدید سے جو اختلاف چلا آ رہا تھا اس کی شدت کو کم کرنے بلکہ اسے بالکلیہ ختم کرنے کے لیے شاہ صاحبؒ نے جو مساعی صرف کیں اور جس کد و کاوش سے اس معاملہ کو سلجھانے کی مخلصانہ جد و جہد کی، اس سے شاہ صاحب کی امت مسلمہ کے لیے دردمندی اور دل سوزی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ ایک تشنۂ تحقیق موضوع تھا جس پر اس سے قبل اس بھرپور انداز میں کسی بھی عالم یا فقیہ کو کام کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

مکاتب فکر کے اختلاف کو دور کرنے کی کوشش وہی شخص کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم کی بے پایاں دستوں سے بہرہ ور فرمایا ہو اور جو اسلام کے کاز (CAUSE) سے سچی ہمدردی اور گہرا

خلوص رکھتا ہو۔

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے بہت پہلے امام ابوالحسن الاشعری نے اپنی ایک جامع کتاب "مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین" میں ایسی ہی ایک کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کے اندرونی فرقوں کے مابہ النزاع مسائل کا دیانت دارانہ تجزیہ کیا جائے اور انہیں ایک ایسے رشتہ میں منسلک کر دیا جائے جو اتحاد و اتفاق کا داعی ہو۔ مگر وہ کسی ایسی قدر مشترک کی تلاش میں ناکام رہے تھے، جس پر سب فرقوں کو مجتمع کیا جا سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دور یونانی تفلسف کے ابتدائی غلبہ کا عہد تھا اور دماغوں میں اس کا نشہ بڑا ہی تیز تھا۔ اور کوئی بھی فرقہ اپنے مسلمات کو اسلام کے وسیع تر مفاد کی خاطر ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں فضا اس سے مختلف تھی۔ فرقوں کی تعداد گھٹ کر محدود رہ گئی تھی اور فلسفیانہ افکار و نظریات میں اختلاف کی وہ شدت باقی نہیں رہی تھی جو ازمنۂ وسطیٰ کی علمی تحریکوں کا خاصہ تھی، البتہ اس کی جگہ جاہلی عصبیت کا فتنہ بڑے زور و ں پر تھا اور افتراق بین المسلمین کی خلیج اگرچہ زیادہ گہری نہیں تھی، مگر اس قدر وسیع ہو چکی تھی کہ اسے پاٹنا "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق تھا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں جو ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے، فقہی اختلافات کو حل کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ انہوں نے حنفی اور شافعی کے باہمی اختلافات کی ایسی توجیہ و تطبیق کی کہ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ اختلاف اسی نوع کا ہے، جیسے ایک چشمۂ زلال صافی سے بہ نکلنے والی مختلف جدولیں ہوتی ہیں کہ ان کے راستے اگرچہ مختلف نظر آتے ہیں مگر درحقیقت ان کا منبع و مخرج بھی ایک ہوتا ہے۔ اور ان کی منزل بھی مختلف نہیں ہوتی۔ "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں جو ان کی دوسری علمی اور تحقیقی کتاب ہے، انہوں نے سنی شیعہ تنازعات پر قلم اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

"قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" اگرچہ ان کی فرقہ وارانہ موضوع پر ایک نہایت علمی کتاب ہے۔ مگر اتحاد و اتفاق کی روح اس کتاب کی بھی ایک ایک سطر میں جاری و ساری ہے اور اس میں نہ

تو ابن تیمیہؒ کی سی تلخی ہے اور نہ ابن حجرؒ مکی کی سی جارحیت۔

تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ پر بھی امت ایک عرصہ سے خلفشار کا شکار ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس باب میں بھی جو موقف اختیار کیا ہے، وہ ان کے نقطۂ نظر کے عین مطابق اعتدال و توازن کا موقف ہے۔ وہ تقلید کے بھی قائل ہیں اور اجتہاد کی ضرورت و اہمیت سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔ غرضیکہ ان کی جملہ تصانیف میں جو مرکزی تصور کارفرما نظر آتا ہے وہ اعتدال و توازن کا تصور ہے اور وہ امتِ اسلامیہ کو اسی توازن و اعتدال ہی کی دعوت دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں قرآن حکیم کو رہنما بنا کر اپنے فکر کی اساس اسی زندہ اور دائمی کتاب پر رکھتے ہیں۔

قرآن حکیم سے شاہ صاحبؒ کی غیر معمولی دلچسپی کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کا فارسی زبان میں "فتح الرحمٰن" کے نام سے ترجمہ بھی کیا اور فن تفسیر کے موضوع پر "الفوز الکبیر" جیسی شاہکار تصنیف بھی یادگار چھوڑی جس سے قرآن فہمی کی دشوار گذار راہ بہت آسان اور سہل ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں آپ کی ایک معرکۃ الآرا کتاب "تاویل الاحادیث" ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو عظیم الشان صلاحیتوں سے حظِ وافر عطا ہوا تھا۔

شاہ صاحبؒ کا ایک زبردست علمی کارنامہ وہ ہے جس میں انہوں نے تصوف کے خشک موضوع کو اپنے قلم کی جولانیوں سے گلرنگ بنایا ہے۔ تصوف کی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں اور تصوف کو ویدانت اور فلسفۂ اشراق کی آمیزش سے پاک کرنے کے سلسلہ میں جو خدمات شاہ صاحبؒ نے سرانجام دی ہیں اور اپنے پیش رو حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی روشنی کے برعکس جس سلامت روی اور حق پژوہی سے انہوں نے ان مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ اس سے ان کے تصوف کے ساتھ غیر معمولی شغف کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان کی سلامت طبع کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

مختصر یہ کہ فکر و نظر کا میدان ہو یا علم و عمل کا حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کی ملی اور دینی خدمات ہر میدان میں انہیں ان کے دیگر اقران و اماثل سے ممتاز کرتی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کی علمی خدمات برصغیر کے تمام نامور اہل تحقیق و تبصرہ کی مجموعی خدمات سے زیادہ وقیع ہیں۔ تو چنداں

مبالغہ نہیں ہوگا۔

اور جہاں تک علم حدیث کا تعلق ہے، اس باب میں تو وہ بلاشبہ ایک منفرد اور مثالی شخصیت نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تن تنہا اس فن شریف کی وہ بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں کہ ان کے معاصرین تو رہے، بجائے خود ان کے پیشروؤں میں بھی خال خال ہی ایسے اصحاب نظر آئیں گے جنہوں نے اس قدر جاں کاہی اور اس درجہ رفعتِ نظر اور ایسے والہانہ اسلوب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کی ترجمہ اور تشریح و تفسیر کی ہو۔ یہ سعادت حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے سینکڑوں صفحات میں بھی اور اپنی بہت سی دیگر تصانیف میں بھی احادیث نبویہ کی جو شرح پیش کی ہے۔ اس سے ان کی جہاں حذاقتِ علمی کا سراغ ملتا ہے وہاں خود احادیث کے مطالب و مفاہیم کے رموز و غوامض بھی آشکارا ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاں تشریح احادیث کے باب میں جدت اسلوب بھی ہے، ندرتِ فکر بھی ہے۔ روایت کا التزام بھی ہے، درایت کا اہتمام بھی ہے اور فقہ و بصیرت کی لہر بھی صاف نظر آتی ہے۔

اپنی ان گوناگوں صلاحیتوں اور بوقلموں قابلیتوں کے ساتھ ساتھ اسلاف سے ان کی گہری وابستگی، ان کی سلامتِ طبع اور ان کی معتدل و متناسب روش نے بھی انہیں ایک دلآویز شخصیت بنا دیا ہے۔ ان کے ہاں ناروا تقشف نہیں ہے جو طبیعتوں پر گراں گزرے، نہ ان کے ہاں غزالیؒ کی سی فلسفیانہ موشگافیاں ہیں، نہ ابن تیمیہؒ کی سی تجرید پسندی اور نہ شیخ احمد سرہندی کی سی تنک مزاجی جو بار بار "بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت آمد" کی تلخی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتی۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ اور مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے مزاجوں میں جو فرق تھا، اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر جہاں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اس نظریہ کے ماننے والوں کے بارے میں بڑا ہی تشدد آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں اور "تاب استماع امثال این سخناں ندارد" کی کبھی کبھی ان لوگوں کو ڈانٹ بھی پلا دیتے ہیں، وہاں حضرت الامام شاہ ولی اللہ اعلیٰ علمی سطح پر اس نظریہ کی ایسی توجیہ پیش کرتے ہیں کہ اگر

شیخ احمد سرہندی ان کے عہد میں ہوتے تو وہ اپنے اس جانشین کو جی بھر کے داد دیتے اور اسے مستحق تحسین ٹھہراتے اور فریقین کا باہمی مناقشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر رہ جاتا اور "وحدۃ الوجود" کے مقابلہ میں "وحدۃ الشہود" کے الگ نظریہ کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔

اور یہ تو صرف ایک مثال بطور اجمال کے پیش کی گئی ہے ورنہ حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ نے فکر و نظر کے جو نئے زاویے ترتیب دیے اور علم و تحقیق کی جو جدید راہیں ہموار کیں ان کے تفصیلی تذکرہ کے لیے ایک طویل دفتر درکار ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے دور انحطاط میں تن تنہا سر و سامان کار کی ناسازگاری کے باوجود تجدید احیائے دین کی گراں بہا ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نباہا جب کہ مسلمان سیاسی اعتبار سے نہایت کمزور اور علمی لحاظ سے بالکل تہی مایہ ہو چکے تھے اور انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو عہد سلف میں صرف وہ لوگ سرانجام دیا کرتے تھے جنہیں ہر قسم کے وسائل کار مہیا ہوتے تھے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کا زمانہ طوائف الملوکی اور افراتفری کا پر آشوب دور تھا۔ وہ جب جوان ہوئے اور شعور سے بہرہ ور ہوئے تو مغلیہ سلطنت کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ مرہٹوں کی ترکتازیوں، جاٹوں کی یورشوں اور سکھوں کی دہشت گردیوں نے مسلمان قوم کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر نادر شاہ کے حملہ نے پوری کر دی تھی۔ اس دور میں ایک شخص ان تمام ہنگاموں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے اور ایک ایسے مقام پر رہتے ہوئے جو برائے نام سہی مگر ہندوستان کا پایۂ تخت اور ملکی سیاست کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا مرکز و محور تھا۔ علم و عمل کی وہ قندیل روشن کرتا ہے اور فکر و نظر کا وہ گلشن آراستہ کرتا ہے کہ آج بھی جب کہ ان کے وصال پر دو صدیاں بیت چکی ہیں۔ اس قندیل کی جگمگاہٹ سے نظریں خیرہ ہو رہی ہیں اور آج بھی اس گلشن کے غنچہ ہائے نادیدہ کی بوئے خوشگوار سے مشام جاں معطر ہے۔

کسے کہ محرم باد صبات مے داند!
کہ باوجود خزاں ہنوز یاسمن باقی است

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا مزاج ہندو تہذیب کے غلبہ و تسلط کے اثرات بد سے کچھ

ایسا ہو گیا ہے کہ ہماری نظر میں اس گوشہ گیر فقیر کی قدر و قیمت زیادہ ہے جو دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں بیٹھ کر اپنا ایک مخصوص حلقۂ ارادت استوار کرتا ہے اور اپنی شدنی اور ناشدنی کرامات اور گفتنی و ناگفتنی تصرفات کے بل بوتے پر لوگوں کو دنیا سے بے رغبتی کا کچھ اس انداز سے درس دیتا ہے اور زخارفِ دنیا سے بے تعلقی کی ایسی پٹی انہیں پڑھاتا ہے کہ وہ قنوطیت کا شکار ہو کر اس آستانۂ عقیدت پر اپنا سب کچھ تیاگ دیتے ہیں اور یوں ایک نیابت کدہ تیار ہو جاتا ہے، جہاں پوجا پاٹ کے تمام مراسم بڑے خشوع و خضوع سے سرانجام دیے جاتے ہیں اور اس فقیر بوریا نشین کی آئندہ نسل کے لیے عیش و عشرت کا ہر سامان فراہم ہونے لگتا ہے۔ قوالی کی محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ گانے بجانے کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ نذر و نیاز کے چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور راگ رنگ کی خوش فعلیاں دلوں کو لبھاتی اور نظروں کو گرماتی ہیں۔

اس کے برعکس جو شخص اپنے جگر کو خون کر کے، اپنی نیندیں حرام کر کے اور اپنے راحت و آرام سے یکقلم بے نیاز ہو کر خلق خدا کی بہبود کے لیے اپنے اوقاتِ عزیز کا ایک ایک لمحہ صرف کرتا ہے جو کبھی محراب و منبر کے ہنگاموں کو اپنی دلسوزیوں سے آباد کرتا ہے، کبھی انجمن در خلوت کے مزے لوٹتا ہے اور کبھی خلوت در انجمن کے عالم استغراق میں قال اللہ اور قال الرسول کی مسند پر بیٹھ کر درس و تدریس کا مشغلہ جاری کرتا ہے، کبھی دعائے نیم شبی میں مصروف ہوتا ہے تو کبھی آہ سحرگاہی میں مشغول رہتا ہے، کبھی تبلیغ و اشاعتِ دین کے جوکھم میں اپنی جان کو ڈالتا ہے اور کبھی دار و رسن کی آزمائش کے مرحلہ کو سر کرتا ہے۔

ان بے پناہ تکلیفوں اور مصیبتوں کا ہنستے اور مسکراتے ہوئے استقبال کرنا اور اس پر بھی جادۂ استقامت سے منحرف نہ ہونا اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دینا معمولی بات نہیں ہے۔

مگر زمانہ اور اہل زمانہ کی قدر ناشناسی کا حال یہ ہے کہ وہ اس قسم کے اربابِ عزیمت کو طاقِ نسیان کی نذر کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اپنی حیاتِ ملی کے ایک بیش بہا اثاثہ کو نذرِ تغافل کر رہے ہیں۔

زندہ قومیں اہلِ علم کی قدر افزائی کا جس قدر اہتمام کرتی ہیں اور ان کی عزت و احترام کی پاسداری کے لیے جو اقدامات بروئے کار لاتی ہیں۔ ہم نام کے مسلمان اگر اپنے واجب الاحترام اصحاب علم و فضل کے لیے اگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تو ہمیں اس نسبت سے دستکش ہو جانا چاہیئے جس نسبت پر ہم اقوام عالم کی مجلسوں

میں فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرت الامامؒ ہماری ستائش و تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے جو کچھ خدمتِ قوم و ملت سرانجام دی ہے اس کا صلہ وہ اپنے ربّ سے ضرور پائیں گے، اس لیے کہ ان کا عمل جس ذات کی رضاجوئی کے لیے تھا وہ اپنے خدمت گزاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتی اور ان کی خدمات کو رائیگاں نہیں ہونے دیتی۔ لیکن ہمیں بھی تو اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر سوچنا چاہیے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ہم نے حضرت الامامؒ کے پیغامِ حیات افروز سے کیا استفادہ کیا ہے اور کہاں تک فیض یاب ہوئے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات سے کوئی پچپن ۵۵ سال بعد ۱۸۱۸ء میں کارل مارکس پیدا ہوتا اور پوری نسلِ انسانی کی تاریخ کو اپنی مادی تعبیر کی رو سے مسخ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب یورپ اور ایشیا کے وسیع و عریض خطوں میں انقلاب کی ایک زبردست لہر پیدا کرتی ہے جو زارِ روس کے تخت و تاج کو ایک ہی ہلّہ میں بہا کر لے جاتی ہے اور کوملتانگ کے قصرِ بلند بام کو مسمار کر کے رکھ دیتی ہے اور ابھی اس کی موت پر ایک صدی بھی گزرنے نہیں پاتی کہ دنیا کا ہر برِ اعظم اس کے نام کی سطوت سے کانپنے لگتا ہے مگر ایک ہم ہیں کہ ہمارے پاس قرآن حکیم جیسی عظیم الشان دستور کی کتاب موجود ہے۔ ہمارا پیغمبر نسلِ انسانی کا آخری راہ نما جس پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا ہے، جس کی پاکیزہ تعلیمات نے دنیا کی ایک انتہائی پس ماندہ اور منتشر قوم کو ایک ایسی متمدن، ترقی یافتہ اور متحد قوم کے روپ میں ڈھال دیا کہ اس نے ایک قلیل مدت میں قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے ایسے ایسے جلیل القدر اور نامور انسان پیدا ہوئے۔ لیکن ہماری تہی دامنی کا یہ عالم ہے کہ ہم کاسۂ گدائی لے کر دوسری قوموں کے نظریات کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ اور ہمیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا اور کوئی منزل متعین نہیں ہو رہی جس کی سمت رُخ کر کے ہم قدم بڑھا سکیں اور اقوامِ عالم کی صف میں اپنے لیے عزت و احترام کا شایانِ شان مقام حاصل کر سکیں۔

تعجب بھی ہوتا ہے اور دکھ بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری نئی نسل ماضی کے ورثہ سے اپنا

رشتہ بڑی تیزی سے منقطع کرتی چلی جارہی ہے اور اپنی کوتاہ نظری اور کم سوادی کی بدولت اسلاف کی میراث سے محروم ہوتی جارہی ہے ع

وائے گر و اپس امروز بود فردا ئے

ہمارے مغرب زدہ طبقہ کو جو مغربی تہذیب کی مادی ترقی سے بری طرح مرعوب ہو کر شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو چکا ہے، یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اگر مغرب کے پاس ہیگل ہے کانٹ ہے، نطشے ہے، ڈارون ہے، فرائڈ ہے، مارکس ہے تو اس کے مقابلہ میں ان سے بدرجہا بہتر شخصیتیں مسلمانوں کے اوراقِ تاریخ میں بھی موجود ہیں۔ جو اپنے افکار و نظریات میں مثالی شخصیتیں قرار دی جاسکتی ہیں اور جن کا جواب آج تک مغرب پیش نہیں کر سکا اور اپنے سائنٹیفک ترقی کے حیرت خیز مظاہر کے باوجود نہ آئندہ کبھی پیش کر سکے گا ؎

اولئك آباءى فجئنا بمثلهم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

لوگ اگر ابن رشدؒ کو بھول گئے ہیں، اگر ابن حزم اندلسیؒ انہیں یاد نہیں رہا، اگر محقق طوسی اور ذکریا رازی اور ابوالحسنؒ اور ابوالقاسم اندلسیؒ اور فخرالدین رازی اور بوعلی سینا اور ان سے بھی پہلے علمِ کیمیا کا موجد جابر بن حیان کے نام بھی ان کے حافظہ سے فراموش ہو گئے ہیں اور اگر شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، غزالیؒ، عمر خیام اور ابوالعلا المعری کے اجتہادی تصورات پر ان کی نظر نہیں رہی اور ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، جلال الدین السیوطیؒ کے کارناموں کا علم نہیں ہے اور اگر وہ مسعودی، ابن حوقل، طبری، البیرونی اور ابن خلدون کے ناموں سے آشنا نہیں ہیں تو چلئے چھوڑ دیئے کہ یہ لوگ بہر حال اس دیس کے رہنے والے نہیں تھے، لیکن وہ عظیم و جلیل شخصیتیں جو اسی برصغیر کی عجمی آب و ہوا میں پروان چڑھیں اور جو اسی دھرتی کے باشندے اور اور اسی سرزمین کے باسی تھے ان کی کارگذاریوں کو تو خود فراموشی کے گڑھے میں نہ گرائیے کہ اگر آپ نے انہیں بھی نظر انداز کر دیا تو آپ کا ماضی سنسان ہو کر رہ جائے گا اور آپ کے قومی تشخص کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرے گی اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔

برعظیم ہند و پاک نے ایسی بہت سی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنہیں دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ اور متمدن اور مہذب قوم کے نامور ہیروؤں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے اور بدیہی شواہد کے ذریعے ان کی برتری کو نمایاں ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ دوسری قوموں کے مشاہیر کو ان کی عظمت کے سامنے سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی عظیم شخصیتوں میں سے ایک نمایاں نام حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلوی قدس سرہٗ کا ہے جنھوں نے آخر میں آکر پہلوں کے ادھورے کام کو مکمل کر دیا۔